Fikr-o-Nasar (Islamabad) 32:3 (1995)

رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات
اور
عقل انسانی کی تشکیل نو

محمد الغزالی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا بنیادی محور بلا شبہ اہل ایمان کی انفرادی اور اجتماعی تعلیم اور تزکیہ (۱) تھا جس کی بنیاد پر آپ ؐ نے اس جامع تہذیب اور مثالی معاشرہ کی ایسی عمارت تعمیر فرمائی جس کے حدود آفاقی تھے اور جس کے اخلاقی اور روحانی پیغام کے مخاطب قیامت تک آنے والے تمام انسان تھے (۲) ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ ؐ نے عمومی طور پر تاریخ انسانی کو جو نئی جہتیں عطا کیں اور ان کے نتیجہ میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جن کے اثرات امت اسلامیہ کے دائرہ سے باہر عام انسانی معاشروں میں بھی ظاہر ہوئے۔ اس بناء پر تاریخ انسانی کو واضح طور پر دو مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک آپ ؐ سے پہلے کا عہد اور ایک آپ ؐ کے بعد کا۔ یہ دونوں عہد اپنی امتیازی خصوصیات کی بناء پر الگ الگ پہچانے جا سکتے ہیں۔ آپ ؐ کی بعثت اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں میں پیدا ہونے والی ہمہ گیر تبدیلیوں کے ساتھ ہی انسانی تہذیب و تمدن میں ایک نیا موڑ آیا اور انسانی معاشرہ ایک نئے آفاقی تہذیبی عہد اور جدید فکری دور میں داخل ہو گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے براہ راست نتائج تو ظاہر ہے کہ ان افراد کے طرز عمل اور اس معاشرہ کے اجتماعی رویہ میں رونما ہوئے جنھوں نے آنحضرت ؐ کی دعوت پر لبیک کہہ کر اپنے ہمہ پہلو طرز حیات میں آپ ؐ کے عطا کردہ ابدی پیغام کو جاری اور نافذ کیا اور

صبغتہ اللہ میں اپنے آپ ؐ کو پوری طرح رنگ لیا، لیکن اسکے علاوہ آپ ؐ کی تعلیمات کے بعض بالواسطہ اثرات ایسے ہیں جو ان افراد اور معاشروں پر بھی پڑے جو دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی سعادت سے محروم رہے۔ یہ ایسے اثرات تھے جن کے نشانات آج بھی انسانی تہذیب و تمدن میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس دنیا میں رحمتہ للعالمین نے زندگی بسر کی اس دنیا کے باسی آپ ؐ کی اصلاحات کی برکات سے کیسے محروم رہ سکتے تھے۔ آپ ؐ کی روشن کردہ مشعل کی براہ راست روشنی اس عالم انسانی کے بہت سے اجزاء کو تو پوری طرح منور کر گئی لیکن جو حصے اس حلقہ نور وہدایت سے باہر رہ گئے ان پر بھی صدیوں سے چھایا ہوا اندھیرا اتنا گہرا نہ رہا جتنا اس دنیا میں آپ ؐ کی آمد سے پہلے تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے انسانوں میں رائج علمی اسالیب، فکری رجحانات، تہذیبی اشکال، اخلاقی اطوار اور روحانی اقدار کو یکسر ایک نیا رخ دے دیا۔ اس مختصر مضمون میں یہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ آنحضرت کی تعلیم و اصلاح کے نتیجہ میں عقل بنی آدم کے سامنے کیا کیا جہتیں وا ہوئیں اور فکر انسانی کو کون کون سی نئی راہیں ملیں اور ان کے کیا اثرات بنی نوع انسان کے عمومی علمی رویوں اور فکری رجحانات میں ظاہر ہوئے۔

اس جائزہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ خالص مذہبی سوچ کا کیا رنگ آپ ؐ کی بعثت سے پہلے دنیا میں رائج تھا اور آپ ؐ کی تشریف آوری کے بعد اس میں کیا تبدیلی واقع ہوئی۔ دوسرے حصہ میں ہمیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ اس عالم شہود کو دریافت کرنے اور اسکے گوناگوں مظاہر کی توجیہ کرنے کے معاملہ میں آپ ؐ کے عہد مبارک سے پہلے انسانوں کے درمیان کیا طریقے اور اسالیب مروج تھے اور آپ ؐ کی تعلیمات نے ان کو کون سا رخ دیا۔

ہم جب انسانی تاریخ اور خصوصاً ماضی کے اس دور پر نظر ڈالتے ہیں جس کا تعلق عہد معلوم سے ہے تو ہمیں یہ بات نظر آتی ہے کہ آپ ؐ کی بعثت سے پہلے عام طور پر مذہبی علم ایک ایسی میراث سمجھا جاتا تھا جس پر معاشرہ کے ایک متعین طبقہ کی مکمل اجارہ داری قائم تھی۔ مذہبی علم تک عوام الناس کی کوئی رسائی نہ تھی۔ ان کا کام محض یہ قرار دے دیا گیا تھا کہ وہ مخصوص افراد کی بلا چون و چرا تقلید کرتے رہیں اور ان کا اندھا اتباع کرتے رہنے ہی کو روحانی فضائل کے

حصول کا واحد ذریعہ سمجھتے رہیں۔ اس طرح عام لوگ مذہبی زندگی اختیار کرنے کے لئے احبار اور رہبان سے رجوع کرنے پر مجبور تھے' نہ صرف یہ کہ مذہب کو قبول یا رد کرنے میں ان کا کوئی اختیار نہ تھا بلکہ ان پر لازم تھا کہ وہ احبار اور رہبان کو واحد اور آخری مرجع تقلید تسلیم کر کے ان کے احکام کی پیروی کریں۔ یہ حق ان کو بالعموم حاصل نہ تھا کہ وہ مذہبی تعلیمات کے بنیادی مأخذ اور اولیں ذرائع سے براہ راست یہ معلوم کرلیں کہ جس مذہب کے وہ متبع ہیں اس کے کیا عقائد و اعمال ہیں اور وہ کن اصولوں پر مبنی ہیں۔ کسی کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ ایک مرتبہ ان عقائد کو سمجھ بوجھ کر اختیار کرکے از خود ان تعلیمات کو اپنی زندگیوں میں جاری کرلے اور اسے پھر کسی مذہبی پیشوا سے رجوع کرنے کی ضرورت نہ رہے۔

بعض مذاہب نے تو انسانوں کو باقاعدہ الگ الگ طبقات میں بانٹ رکھا تھا اور صرف ایک متعین اور بالادست طبقہ کا یہ حق تسلیم کیا جاتا تھا کہ وہ مذہبی علم کو حاصل کرے اور اس علمی تفوق کی بناء پر عام انسانوں (Laity) کو بعض افکار و اعمال اور رسوم و قیود کا پابند کردے۔ اس صورت حال میں ایک عام انسان کی یہ مجال کیسے ہوسکتی تھی کہ وہ کسی طے شدہ اصول یا مقررہ ضابطہ کی بنیاد پر جس کو وہ براہ راست جانتا اور سمجھتا ہو' اس خود ساختہ مذہبی طبقہ کے اوامرونواہی کو ماننے میں پس و پیش کرے اور خود اس مذہب کی تلقین کو عقل و شعور سے سمجھ کر اپنے ضمیر کی تسکین کا سامان کر سکے۔ یہ اسی اجارہ داری کا نتیجہ تھا کہ قرون وسطی میں کلیسا کے فکری استبداد اور مذہبی استعمار کے خلاف احتجاج کی ایک شدید لہر اٹھی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے تمام دنیائے مغرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا' اس احتجاج کے اثرات اس قدر گہرے اور طویل المیعاد ہوئے کہ مذہبی تصورات سے عام بیزاری آج بھی مغربی معاشروں کا طرہ امتیاز بنی ہوئی ہے۔

یہ صورت حال بعثت نبوی سے پہلے کے تقریباً تمام قابل ذکر مذہبی معاشروں میں موجود تھی۔ وہ عیسائی قساوسہ ہوں یا یہودی احبار' ہندو پنڈت اور پروہت ہوں یا بدھ کے تارک الدنیا پیروکار ' ان سب کی مذہبی حیثیت کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ مذہبی علم تک رسائی صرف ان ہی کی جماعت کو حاصل ہے اور وہی اپنے ماننے والوں کی رہنمائی کے حق دار ہیں۔ عام آدمی کا کام صرف یہ ہے کہ اپنے مذہبی پیشواؤں کی ہدایات پر بلا چون وچرا عمل پیرا رہے اور اپنے مذہبی رویہ کی تمام تفصیلات اور جزئیات ان ہی سے معلوم کرتا رہے۔ ظاہر ہے کہ اس اجارہ داری کے نتیجہ

میں عام لوگوں کی مذہب کے ساتھ دلی وفاداری اور روحانی وابستگی کمزور پڑتی گئی اور وہ رفتہ رفتہ ذہنی اور جذباتی طور پر مذہب سے پہلے لاتعلق اور پھر دور ہوتے گئے۔ سطحی طور پر مذہب سے وابستگی صرف مخصوص مذہبی طبقات تک محدود ہو کر رہ گئی اور یہ وابستگی بھی کوئی دلی تعلق یا شعوری وفاداری کی بناء پر نہ تھی بلکہ محض مفاد پرستانہ ہم آہنگی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب محض چند ظاہری رسوم اور خارجی مظاہر کا مجموعہ بن کر رہ گیا اور انسانوں کے سیرت و کردار اور ان کی قلبی اور ذہنی زندگی سے اس کو کوئی علاقہ نہ رہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں منصہ تاریخ پر جلوہ افروز ہوئے تو مذہبی علم و عمل کی کم و بیش یہی حالت تھی جو اوپر بیان کی گئی ۔ اس صورت حال میں کچھ استثناء ات بھی ہوں گے اور یقیناً تھے لیکن " الحکم علی الاغلب " کی رو سے یہ دعوی بلا خوف تردید کیا جا سکتا ہے کہ آپ ؐ کے عہد مبارک سے قبل کے انسانی معاشرے حصول علم کے مساوی مواقع اور منصفانہ حقوق کے تصور سے قریب قریب ناآشنا تھے۔ خصوصاً مذہبی علم کے معاملہ میں۔

انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہبی علوم پر اجارہ داری کا خاتمہ کیا۔ آپ ؐ نے نہ صرف یہ کہ اس خیال کو یکسر مسترد کیا کہ ایک عام آدمی مذہبی معلومات کے حصول کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ آپ ؐ نے ہر اس مرد اور عورت کے لئے جو حلقہ بگوش اسلام ہو گیا ہو' (گویا اپنی تشکیل کردہ اجتماعی تنظیم کے تمام افراد کے لئے) بلااستثناء طلب علم کو فریضہ قرار دے دیا۔ آپ ؐ کی یہ تعلیم منشائے ایزدی کے بالکل موافق اور فرمان الہی کے عین مطابق تھی۔ چنانچہ قرآن کریم نے بار بار اپنے مخاطبین کو حصول علم اور تفکر و تدبر کا حکم دیا (۳) اور اس اہم ترین فرض کی اہمیت واضح کرتے ہوئے اس کی ادائیگی کی بار بار یاد دہانی کرائی بلکہ قرآن کے علاوہ دنیا کی کسی مذہبی کتاب میں عقل و شعور کے استعمال اور اس کے ذریعہ معرفت حق تک پہنچنے کی اہمیت اور ضرورت پر اتنا زور نہیں دیا گیا جس قدر شد و مد سے کتاب اللہ نے اس کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ یہ کتاب الہی جب نازل ہو رہی تھی تو آپ ؐ کا طریقہ یہ تھا کہ جونہی کوئی سورت یا اس کا کوئی حصہ آپ ؐ پر نازل ہوتا آپ ؐ فوراً اس کو اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجمع تک پہنچاتے اور اس کے ساتھ ہی بالالتزام صحابیات رضی اللہ عنھن کے اجتماع میں پہنچاتے۔

یہ وہ اولین اقدام تھا جو آپؐ نے وحی کے ذریعہ حاصل شدہ ہدایات اور تعلیمات کو بیک وقت تمام مسلمان مردوں اور عورتوں تک پہنچانے کے لئے کیا اور ایک لمحہ کے لئے بھی معرفت وحی اور حکمت نبوی کو کسی مسلمان مرد یا عورت سے مخفی نہ رہنے دیا۔ اس طرح آپؐ نے قرآن کی عائد کردہ ذمہ داری تلاوت آیات، تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ کا ہدف ان تمام افراد کو بیک وقت بنایا جن کی طرف آپؐ کو ہادی و مرشد اور معلم و مربی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ لیکن چونکہ ہر فرد کی عقلی استعداد اور فکری صلاحیت برابر نہیں ہوتی اور نہ ہی آج تک کسی نے اس کا دعویٰ کیا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ آپؐ کے مخاطب مومنین اور مومنات میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی قابلیت کے مطابق ہی علوم کتاب و حکمت کو حاصل کیا اور اپنے اپنے ظرف اور روحانی صلاحیت کے لحاظ سے مدارج اخلاق اور معارج معرفت طے کیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و تزکیہ کا جو فریضہ انجام دیا اس کا سب سے بڑا نتیجہ تو یہ برآمد ہوا کہ مذہبی علم پر کسی متعین جماعت کی اجارہ داری آپؐ کی تشکیل کردہ امت میں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی اصلاح و تربیت کا ایک اہم نتیجہ یہ بھی نکلا کہ علم دین عمل صالح (۴) کے ساتھ مربوط ہو گیا۔ قرآن کی تعلیمات میں جیسا کہ عرض کیا گیا، حصول علم اور وصول معرفت پر جہاں شد ومد کے ساتھ زور دیا گیا وہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کسی مقام پر بھی علم کو عمل سے الگ نہیں کیا گیا۔ انسان کو صرف اس علم کے حصول پر فضیلت کا سزاوار قرار دیا گیا جو عمل صالح پر منتج ہو اور جو انسان کے لئے اس کی تکمیل انسانیت میں مددگار ثابت ہو۔ اس لئے کہ محض نظری معلومات، فکری موشگافیاں اور ذہنی قلابازیاں نہ دنیا میں انسان کو فلاح تک پہنچا سکتی ہیں اور نہ آخرت میں اس کی سعادت کی ضامن ہو سکتی ہیں۔ علم و عمل اس کے تلازم کا ایک منطقی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ حاملان علم دین کی بزرگی کا پیمانہ ان کے علم و عمل کا تطابق قرار پایا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان معاشرہ کے مزاج میں یہ بات اول دن سے رچ بس گئی کہ ایسے شخص کی دانش کی کوئی حیثیت نہیں جس کا عمل اس کے علم کا پابند نہ ہو (۵)

آپؐ کی اس تعلیم کا دوسرا بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ دین کے جملہ عقائد واعمال ایک ایسی معروضی حقیقت بن گئے جن تک رسائی ہر اس فرد کو حاصل ہو گئی جو اخلاص نیت کے ساتھ ان حقائق کو معلوم کر کے ان کے فکری مطالبات اور عملی تقاضوں کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنا چاہتا

ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے آپ ؐ نے نہ تو کسی نسل سے تعلق ضروری قرار دیا نہ کسی علاقہ سے وابستگی شرط ٹھہرائی بلکہ علم دین کے واضح اصول اور معیارات آپ ؐ نے اپنے اقوال، افعال اور تقریرات کے ذریعہ متعین فرما دیئے۔ قرآن کریم نے بارہا اس بات کو واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے کہ (۶) "یہ آیات بینات ہیں"، "اس کتاب میں کسی شک کی گنجائش نہیں" (۷)۔ "اس کے بیانات اور اعلانات میں کہیں کوئی ابہام یا غموض نہیں" (۸)، "یہ کتاب تمام انسانوں کے لئے پیغام ہے" (۹) اور یہ کہ "ہدایت گمراہی سے الگ پہچانی جا سکتی ہے" (۱۰) وغیرہ وغیرہ۔ اسی مضمون کے بیانات ہمیں بکثرت احادیث نبویہ میں بھی ملتے ہیں کہ حلال بھی پوری طرح واضح ہو چکا ہے اور حرام بھی متعین ہو چکا ہے اور یہ کہ جو شخص بھی اخلاص و یقین کے ساتھ ان عقائد کو اپنے قلب و ضمیر میں راسخ کر کے ان کے مطابق کچھ متعین اعمال کا اپنے کو پابند کر لے، اس کے نصیب میں فلاح و سعادت لکھ دی جائے گی۔ اور یہ کہ اللہ سے انسان کا تعلق براہ راست ہے اسے دعا کے لیے کسی واسطہ کی ضرورت نہیں، توبہ بھی براہ راست اللہ ہی قبول کرتا ہے، مغفرت کی امید بھی اسی سے کرنی چاہئے، انسان کو نجات کے لیے کسی دوسرے انسان کی نہیں بلکہ خالص اللہ کی رضا مندی درکار ہے، اور یہ کہ انسانوں کے درمیان فضیلت کا معیار صرف تقوی ہے (۱۱) اور حقیقی تقوی وہ ہے جو دل میں جاگزین ہو اور دل کا حال صرف اللہ ہی جانتا ہے لہٰذا تقوی کے نام پر بھی کسی کو تعلی زیبا نہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح اس دین کے تمام بنیادی اصول، اخلاقی تقاضے اور عملی مطالبات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر موقعہ پر مختلف پیرایوں میں محکم الفاظ میں بیان کر دیئے۔ ہر سطح کے لوگوں کو آپ ؐ نے مخاطب بنایا اور ان کی علمی قابلیت اور عقلی صلاحیت کے مطابق ان کے ذہنوں میں پوری طرح اس دین کے پیغام کو بٹھا دیا کہ کہیں کوئی غلط فہمی یا حق و باطل کے درمیان التباس کی گنجائش نہ رہے۔ جہاں ضرورت ہوئی آپ ؐ نے مثالوں کی مدد سے بات کو واضح کیا اور ماضی کے واقعات کے ذریعہ تشریح فرما دی۔ اس کے علاوہ اس دنیا سے پردہ فرمانے سے پہلے آپ ؐ نے حجتہ الوداع کے عالمی اجتماع میں ہر رنگ و نسل، علاقہ اور قبیلہ سے تعلق رکھنے والے اہل ایمان کے سامنے اسلام کے ابدی پیغام کی تمام بنیادی حقیقتوں اور اس کے جملہ تقاضوں کو خوب کھول کھول کر عام فہم اسلوب میں سمجھا دیا، اور اللہ تعالی کو تین مرتبہ اس بات پر گواہ بنایا کہ آپ ؐ نے بلا

کسی افراط و تفریط یا غموض و ابہام کے اس کے آخری پیغام کو انسانوں تک پہنچا دیا ہے۔ آپ ؐ نے اس پر ہی بس نہیں کیا بلکہ تمام حاضرین کو اس ذمہ داری کا امین بنایا کہ وہ ان لوگوں تک بھی اس پیغام کو پہنچا دیں جو اس تاریخی اجتماع میں حاضر نہ تھے۔ یعنی نہ صرف ان لوگوں تک اس پیغام کو پہونچانے کی ذمہ داری سونپی جو ان حاضرین کے معاصرین تھے بلکہ ان سلف کے خلف تک بھی اس امانت کو بلا انقطاع اور تسلسل کے ساتھ سپرد کرتے رہنے کی تلقین فرمائی۔ اور سب سے بڑھ کر آپ ؐ نے یہ کیا کہ اسلام کی جملہ تعلیمات کو ان کی تمام تفصیلات و جزء یات کے ساتھ خود اپنی زندگی میں پوری طرح نافذ کرکے دکھا دیا جو اللہ نے آپ ؐ کے ذریعہ انسانوں تک پہنچائیں تھیں۔ چنانچہ آپ ؐ کا اسوہ حسنہ اپنی تمام تر ہمہ گیری، توازن، جامعیت، اخلاقی کمال، روحانی جمال اور پیغمبرانہ جلال کے ساتھ ایک عام انسان کے لیے قابل فہم بھی تھا اور قابل عمل بھی۔ اس میں جہاں انفرادی بشریت کے تقاضوں کا پورا پورا لحاظ تھا وہاں انسانی اجتماعیت کی ضروریات کی بھی پوری تکمیل تھی۔ پھر آپ ؐ کا اسوہ ایسی کھلی کتاب کی مانند تھا کہ اس کی تمام تفصیلات تاریخ کی سرچ لائٹ کے سامنے آج بھی اسی طرح روشن ہیں جس طرح سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں روشن تھیں۔ آپ ؐ نے عقائد اور اعمال، اخلاق اور معاملات، عبادات اور روحانیات اور ان کے تمام ضروری پہلوؤں کی ایک ایک گتھی کو جس طرح کھول کھول کر بیان کیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ روز اول سے اسلامی معاشرہ میں دین کا علم عام ہوگیا اور ہر فرد کو یکساں طور پر دستیاب رہا۔

تاریخ اسلام کے صفحات اس بات کے گواہ ہیں کہ علوم اسلامیہ کی تدریس و تحقیق، ترویج و ترقی اور تشکیل و تدوین میں جس قدر حصہ عربی النسل اہل علم کا رہا، اس سے کہیں بڑھ کر ان اصحاب دانش کا ہوا جو دیگر نسلوں اور علاقوں سے تعلق رکھتے تھے، اور دائرہ اسلام میں آپ ؐ کی اور آپ ؐ کے صحابہ اور تابعین اور ان کے بعد کے مسلمانوں کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے داخل ہو گئے تھے۔ اس بات کو کون نہیں جانتا کہ تابعین کے دور میں جتنے حضرات علوم قرآن میں نمایاں ترین تھے اور مرجع کی حیثیت رکھتے تھے، ان کی اکثریت موالی یعنی آزاد کردہ غلام تھی۔ چنانچہ علوم قرآن کے طالبان علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ تابعین کی جماعت میں حضرت سعید بن جبیر، مجاہد بن جبر، عکرمہ البربری، طاوس الیمانی، عطاء بن ابی رباح اور

زید بن اسلم کا علماء قرآن کی حیثیت سے کتنا بلند مقام تھا۔ یہ سب کے سب حضرات آزاد کردہ غلام تھے۔ یعنی رحمتہ للعالمین کے قائم کردہ معاشرہ میں ان کی معاشرتی حیثیت اس قدر بلند ہوئی کہ وہ غلامی کے درجہ سے اٹھ معاشرہ میں رائج الوقت علوم کی افضل ترین قسم یعنی علوم قرآن پر اس طرح حاوی ہو گئے کہ بڑے بڑے اصلی نسلی اور نجیب الطرفین عرب علماء اور طالبان علم ان کی طرف رجوع کرنے لگے اور ان موالی حضرات کو اس میدان میں سند کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

تاریخ اسلام کی شہادت یہ بھی ہے کہ علماء عرب کے علاوہ عراق' شام' مصر' اندلس' ترکی' ماوراء النہر اور ہندوستان کے علماء نے یکے بعد دیگرے اسلامی علوم کی میراث کی حفاظت کی اور باری باری سب کے ہاتھوں اس عظیم الشان روایت کو ترقی اور فروغ حاصل ہوتا رہا۔ یعنی کسی رنگ یا نسل' کسی علاقے یا قوم کے انسانوں کے لئے کبھی کوئی رکاوٹ اس مقصد کے حصول میں حائل نہ ہوئی۔ خود ماضی قریب میں اور ہمارے اپنے زمانہ میں اسکی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ خالص مغربی معاشرہ اور لادینی ماحول سے اٹھنے والے افراد نے اس دین کو قبول کر کے اس کو سیکھا اور اس کے علوم کی مختلف شاخوں میں مہارت حاصل کی اور ان کو امت اسلامیہ کی طرف سے سند قبولیت حاصل ہوئی ۔ آسمان علم و حکمت کے ان درخشاں ستاروں میں ماضی قریب کے محمد مارماڈیوک پکتھال' علامہ محمد اسد' فرتھیاف شیون' رینے گینوں' عبدالکریم جرمانوس اور عصر حاضر کے مارٹن لنگس اور روجے گارودی کے نام بے ساختہ زبان پر آتے ہیں کہ یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے مغربی معاشروں میں جنم لیا اور وہیں پلے بڑھے اور جوان ہوئے اور جب اللہ تعالی کی توفیق وہدایت سے یہ لوگ دامن رحمتہ للعالمین سے وابستہ ہوئے اور ان کے پیغام کی تفہیم و ترویج کے لیے اپنے کو وقف کیا تو اپنی علمی فتوحات اور فکری کارناموں کی بناء پر علماء اسلام کی توقیر و تحسین کے مستحق ہوئے اور امت اسلامیہ نے بجا طور پر ان حضرات کو باعث افتخار ولائق اعتزاز سمجھا۔

مذہبی علوم پر جس اجارہ داری کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا' اس کے ساتھ ساتھ اکثر معاشروں میں عموماً اور عیسائی معاشرہ میں خصوصاً یہ صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ صرف مذہبی علوم ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے علم اور فکر پر عام انسانوں کے لئے ایک قدغن لگا دی گئی تھی۔ جیسا کہ سب

جانتے ہیں کہ جب سلطنت روما نے عیسائیت کو قبول کر لیا تو مذہب عیسائیت کی بنیاد ایک داخلی ایمان وایقان اور روحانی تجربہ کے بجائے رفتہ رفتہ محض ایک دینوی اتھارٹی پر قائم ہوگئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اس اتھارٹی نے عیسائیت کے ماننے والوں کا معبود حقیقی سے تعلق پیدا کر کے ان کو قلبی اطمینان، روحانی تسکین اور عقلی تلقین مہیا کرنے کے بجائے رفتہ رفتہ پہلے اپنے ظاہری اقتدار اور پھر ظالمانہ جبروتسلط کے تابع کر لیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مذہب کے نام پر بدترین استبدادی نظام انسانوں پر قائم کر دیا گیا۔ یہ صورت حال ظاہر ہے، زیادہ چلنے والی نہیں تھی۔ اس کے بعد جو مرحلہ آیا اس میں "یسوع" اور "سیزر" کے اختیارات منقسم اور مستقل بالذات ہوتے گئے۔ انسانوں کی وفاداری بادشاہ اور پاپا کے درمیان بانٹ دی گئی۔ اس عہد میں بھی علمی اور فکری غلامی جوں کی توں باقی رہی۔ یعنی علم اور فکر پر مطلق اختیار کارپردازان کلیسا ہی کو حاصل رہا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب عالم اسلام میں تہذیب و تمدن کو بے انتہاء فروغ مل رہا تھا اور علوم وفنون کو بے مثال ترقی حاصل ہو رہی تھی۔ دمشق، بغداد، بصرہ کوفہ، قاہرہ، قرطبہ، غرناطہ، مقلیہ، سمرقند، بخارا اور دہلی وملتان اور ان کے علاوہ بے شمار مراکز فکروفن اور مدارس علم وحکمت مسلمانوں کے ہاتھوں قائم ہو چکے تھے جہاں سے نہ صرف علوم اسلامیہ کی تعلیم وترویج ہو رہی تھی بلکہ فلسفہ کے افکار اور سائنس کے علوم اور دیگر حرفتیں اور فنون دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہے تھے۔ دارالاسلام کی یہ صورت حال ایک قدرتی نتیجہ تھا اسلام پر مسلمانوں کے ایمان اور قرآن مجید کے اصولوں پر معاشرہ و ریاست کی تشکیل کا، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم دی اس نے انسانوں میں علم وعمل و تفکر وتدبر کی دعوت عام کر دی تھی اور علمی آزادی اور فکری آفاقیت کی یہی کلید آنحضرتؐ نے اپنے صحابہ کرام کو عطا کر دی تھی جس سے نہ صرف علوم اسلامیہ میں ترقی اور توسیع کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا بلکہ دیگر رائج الوقت علوم و فنون کی تشکیل جدید اور تعمیر نو کا عمل بھی شروع ہو گیا تھا۔ علوم وفنون کی تشکیل جدید ہی کا یہ عمل تھا جس نے تجربات ومشاہدات کے فروغ کے دروازے اپنے پرائے سب کے لئے کھول ڈالے۔ یہ آپؐ ہی کی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے یونانی، رومن، ایرانی اور ہندوستانی تہذیبوں سے جو علوم وفنون اخذ کئے ان کو نہ صرف تمام تشنگان علم کے لئے عام کر دیا

بلکہ ان کی کتابوں کے ترجمے کیے' نئے انداز سے شروح لکھیں اور ان کی اس نہج پر توسیع و تشکیل کی کہ نہ صرف مسلم معاشرہ کے عام افراد ان سے مستفید ہوئے بلکہ بے شمار غیر مسلم طلبہ بھی باہر سے آکر مسلمانوں کے جاری کردہ علوم وافکار کے سرچشموں سے حسب توفیق سیراب ہوئے۔

رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں آمد سے پہلے انسانی عقل پر بالعموم ارسطو کی استخراجی منطق کے تصورات و اسالیب کا غلبہ تھا۔ اس دانش برہانی کے فروغ کے ساتھ حیرت کی جو فراوانیاں انسان کے حصہ میں آئیں ان کی وجہ سے عقل انسانی رفتہ رفتہ یونانی منطق کی بھول بھلیوں میں ایسی گم ہوئی کہ بقول علامہ ابن قیم" بڑے بڑے جید اذہان اس کی پیچیدگیوں میں خبط ہو کر رہ گئے۔ ارسطالیسی عقلیت کی اس قدیم روایت نے منطقی بحث وجدل کا ایسا لامتناہی سلسلہ جاری کر دیا جس سے انسانیت کو کوئی مثبت رہنمائی اور دیرپا مدد نہ ملی۔ نہ تو ان مناقشات سے انسانوں کے حقیقی مسائل کی نشاندہی ہوئی نہ ان کی انفرادی اور اجتماعی مشکلات کا کوئی قابل عمل حل فلسفہ کے یہ دفتر فراہم کر سکے۔ البتہ ان مباحث نے فلسفہ کے طالب علموں کو لاتعداد شکوک وشبہات اور بے بنیاد اوھام وظنون میں ضرور مبتلا کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فلسفیوں نے اپنی ایک الگ نظری دنیا بسا لی اور وہ عملی زندگی سے تقریباً لاتعلق ہو کر رہ گئے۔ ان حضرات نے اپنی دانست میں تو اشیاء کی حقیقت معلوم کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن یہ لوگ ہر اہم مسئلہ کو چاہے اس کا تعلق الہیات سے ہو یا اخلاقیات سے' جمالیات سے ہو یا طبیعیات سے' اسے عقلی تعلیلات اور منطقی تاویلات کی بے مقصد معرکہ آرائیوں میں گھسیٹ لائے۔

رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو جس پیغام حق اور صراط مستقیم کی دعوت دی اس میں نہ صرف عقل کی اہمیت اور افادیت کا پورا پورا اعتراف موجود تھا بلکہ علم و عرفان میں عقل کا دائرہ کار اور پیمانہ استعمال پوری طرح سے متعین کر دیا گیا تھا۔ بقول امام غزالی" عقل کی حیثیت اسلام کی نظر میں اس ماتحت بادشاہ کی ہے جس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ انسان کا ہاتھ تھام کر اس کو اپنے سے بڑے بادشاہ یعنی وحی تک پہنچا کر اپنے آپ "کو بھی اس ملک الملوک کی سپردگی میں دے دے اور اس بالاتر اتھارٹی کی ہدایات کے ماتحت خود بھی کام کرنے لگے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجموعی تعلیم و تربیت نے علمی سرگرمی کو ایک ایسے رخ پر ڈال دیا جس کے نتیجہ میں وہ خشک ارسطالیسی منطقیت اور بے مقصد عقلیت سے ہٹ کر بامقصد

استقرائی طرز فکر کے راستہ پر گامزن ہوئی۔ ایک طرف تو منطق استخراجی کا کردار ضروری حد تک محدود ہو گیا اور دوسری طرف علمی کوششیں اور عقلی کاوشیں بے مقصد نظریت کی تنگنائیوں سے نکل کر با مقصد عملیت کی وسعتوں میں سرگرم ہو گئیں۔ اور اس طرح اہل بصیرت کے سامنے کائنات اپنے لامحدود امکانات اور بے پایاں جہتوں کے ساتھ ایک کھلی کتاب کی طرح سامنے آئی اور ارباب علم و فکر اس کے براہ راست مشاہدہ اور مطالعہ میں منہمک ہو گئے۔

آپ ؐ کی تعلیمات نے خالص نظری اور فرضی سوالات کو نظرانداز کرتے ہوئے انسانوں کی دنیوی فلاح اور اخروی سعادت سے براہ راست تعلق رکھنے والے عملی مسائل کو ہی اولین اہمیت کا حامل قرار دیا اور ان میں سے ہر مسئلہ کا کافی اور شافی جواب فراہم کیا۔ آپ ؐ نے اپنے مخاطبین اور بالخصوص اپنے ماننے والوں کے ایسے استفسارات کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی جن کا تعلق روح کی حقیقت، تقدیر الٰہی کی تفصیلات، ذات باری کی کنہ و ماہیت یا عالم غیب کی جزئیات سے تھا۔ اس لئے کہ ان مسائل کی جزئیات و تفصیلات کا احاطہ کرنا نہ انسانی عقل وادراک کے لئے ممکن ہے اور نہ انسان کے سلوک و عمل کے لئے ایک خاص حد سے بڑھ کر ان تفصیلات کی ضرورت ہے۔ مزید برآں انسانی تجربہ شاہد ہے کہ مجرد اور ماورائے مشاہدہ مباحث کی غیر ضروری تفصیلات انسان کو اصلی مقصد سے دور کر دیتی ہیں۔

اس کے برعکس سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہر تجسس اور استفسار کی پوری حوصلہ افزائی فرماتے جس کا تعلق انسانوں کی عملی زندگی اور نجات اخروی کے ناگزیر پہلوؤں سے ہوتا۔ ایسے ہر استفسار کا فوری جواب آپ ؐ کی جانب سے فراہم کیا جاتا۔ بلکہ بعض اوقات تو آپ ؐ خود ایسے سوالات اٹھاتے اور ان کے جوابات مرحمت فرماتے۔ اس کا طریقہ عموماً یہ ہوتا کہ مجلس میں موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کسی اہم مسئلہ کے بارے میں سوال کرتے جس کے جواب میں عموماً صحابہ کرام عرض کرتے: "اللہ و رسولہ اعلم"، اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں، اس پر آپ ؐ اس مسئلہ کا جواب خود بیان فرما دیتے اور اس کے ضروری پہلو مختلف مثالوں اور تشبیہات کی مدد سے آسان اور عام فہم اسلوب میں اس طرح واضح کر دیتے کہ وہ ہر سطح اور ہر ذہن کے آدمی پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا، اگر کبھی آپ ؐ کے اس معمول میں استثناء ہوا ہے تو وہ ایسے مواقع پر ہوا ہے جہاں سوال کرنے والا کوئی غیر مسلم ہو اور آپ ؐ کے پیغام کو

نہ مانتا ہو: ایسی صورت میں مخاطب پر اتمام حجت کی خاطر آپؐ نے ایسے سوالات کا جواب بھی دیا جو براہ راست انسانوں کی فلاح ونجات سے متعلق نہ ہوں یا جن کا تعلق ماضی کے بعض واقعات کی تفصیل سے ہو۔ جیسا کہ قرآن کریم نے بھی ذوالقرنین، حضرت یوسف علیہ السلام اور اصحاب کہف کے واقعات کے بارے میں آپؐ کی رہنمائی فرمائی اور اتمام حجت کی غرض سے مخالفین کی جانب سے اٹھائے گئے ایسے سوالات کے جواب بھی دربار نبوت سے مہیا فرمائے گئے جن کا جاننا پیغام نبوت کے سمجھنے کے لئے ناگزیر نہ تھا۔

لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، آپؐ کی مجموعی تعلیمات نے جس بنیادی نکتہ پر اہل ایمان کی توجہ کو مرکوز کیا اور بار بار آپؐ نے زبانی ارشادات اور عملی اقدامات کے ذریعہ اس کی یاد دہانی فرمائی وہ یہ تھا کہ انسان کو اللہ تعالی نے ایک اعلی اور ارفع مقصد کے لئے اس دنیا میں بھیجا ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے ارادوں اور امکانات کو اپنے خالق و مالک کی منشا اور مرضی کے تابع کر دے اور اس بنیاد پر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو منضبط کرتے ہوئے عدل اور توازن پر مبنی تہذیب وتمدن کی تعمیر میں اپنے تمام وسائل کو صرف کر دے۔ آپؐ کی اس تعلیم کی رو سے ہر وہ چیز محمود ہے جو اس مقصد کی تکمیل میں مددگار ہو اور ہر وہ بات مذموم ہے جو انسان کو اس نصب العین سے بیگانہ کر دے۔ اس تعلیم کا ایک منطقی نتیجہ آپؐ کی یہ تلقین بھی تھی کہ علم برائے علم مطلوب نہیں ہے بلکہ علم برائے عمل مقصود ہے۔ اس لئے آپؐ نے ہمیں جو دعائیں سکھلائیں ان میں یہ دعا بھی شامل ہے: اللھم انا نسئلک علما نافعا... آج یہ بات کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں رہی ہے کہ جب انسان نے علم کو اعلی اخلاقی مقاصد کی پابندی سے آزاد کیا تو اس کو جنگ و جدل، ظلم واستحصال، اور تفرقہ اور انتشار کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا، اور جب سے وہ دانش نورانی کے حلقہ سے نکل کر حکمت ابلیسی کے دائرہ میں داخل ہوا ہے اس کو خارجی امن کی تباہی، داخلی سکون کی بربادی، ماحول کی آلودگی باہمی تعلقات کی بے ثباتی اور بدترین قسم کی لذت پسندی اور مادہ پرستی کے سوا کچھ نہیں ملا۔

اللہ تعالی نے از آدم تا ایں دم جس دین کو انسان کے لئے پسند کیا وہ اسلام ہے اور قیامت تک یہی دین رہے گا۔ اسلام کا اصل الاصول، لا الہ الا اللہ یعنی عقیدہ توحید ہے۔ یہی عقیدہ رحمتہ للعالمین کے پیغام اور تمام انبیاء اور رسل کے سلسلہ رشد وہدایت کا مرکزی محور

ہے۔ آپ ؐ کا ۲۳ برسوں پر محیط مشن درحقیقت توحید ہی کی تعلیم و تشریح اور تنفیذ و ترویج سے عبارت ہے۔ آپ ؐ کی تعلیمات کا کوئی کلیہ یا جزئیہ ایسا نہیں ہے جس کا سرا بالاخر اس بنیادی عقیدہ سے جا کر نہ ملتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس محوری اصول کی روح پوری طرح اس نظام حیات میں سرایت کی ہوئی ہے جس کی دعوت آپ ؐ زندگی بھر دیتے رہے' اور جس کی بنیاد پر آپ ؐ نے فرد کی تعمیر اور معاشرہ کی تشکیل فرمائی۔ یہ توحید کی ربانی تعلیم اور اس کے تابع پیغمبرانہ حکمت کے فروغ کا ہی نتیجہ تھا کہ آپ ؐ کے تربیت یافتہ افراد کے ذہنوں میں کائنات' زندگی اور علم کے متعلق ایک ناقابل تفریق وحدت کا تصور پوری طرح راسخ ہو گیا۔ اور مسلمان علماء' مفکرین' فلاسفہ اور متکلمین کے ذہنوں میں یہ بات اول دن سے روز روشن کی طرح واضح رہی کہ اس عالم غیب و شہود میں ایک ہی ذات وحدہ لا شریک کا حکم کار فرما ہے اور یہ عالم شہود ایک بڑے عالم کا حصہ ہے جو فی الحال پردہ غیب میں ہے۔ اس محسوس اور مرئی دنیا کے کارخانہ میں جو واقعات و حوادث رونما ہو رہے ہیں وہ درحقیقت اس تدبیر ازلی اور تقدیر خداوندی کا نتیجہ ہیں جو ہماری محدود عقل و شعور و حواس سے ماوراء ایک حقیقی عالم بالا کی لامتناہی ابداعی اور تخلیقی سکیم کا حصہ ہے' انسان عقل شعور کی صلاحیتوں سے لیس ہونے کی بناء پر ارادہ اور اختیار کا مالک ہے اور یہ محسوس دنیا اس کے لیے علم و عمل کا وسیع لیکن عارضی میدان فراہم کرتی ہے۔ اس عقیدہ کے ذہن میں مستحکم ہونے کا علمی ثمرہ یہ نکلا کہ ایک ہی جست میں فلاسفہ اور مفکرین نے اس بنیادی اور یقینی مقدمہ تک رسائی حاصل کر لی کہ یہ کائنات ایک مربوط نظام اور محکم تدبیر کے ماتحت کام کر رہی ہے۔ اور اس دنیا کے جو مظاہر و خواص ہمارے شعور و حواس کی گرفت میں ہیں وہ ایک متعین قانون یا سنت اللہ کے پابند ہیں جس میں ذرہ برابر کسی تبدیلی' انحراف یا سہو و خطا کا امکان معدوم ہے۔

اسلامی تاریخ کے عہد زریں میں مسلمان حکماء کے جو بے مثال علمی کارنامے سامنے آئے اور جس طرح انہوں نے کائنات کی مخفی قوتوں کو سمجھنے اور ان میں کارفرما سنت اللہ کے قوانین کو دریافت کرنے میں کامیابیاں حاصل کیں وہ اسی وجہ سے ممکن ہوئیں کہ سائنس کا یہ بنیادی کلیہ انہوں نے رحمتہ للعالمین کی تعلیمات سے سمجھ لیا تھا۔ اس سے پہلے کبھی تاریخ انسانی میں کائنات کے متعلق کوئی نظریہ اس قدر واضح صورت میں سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ اسی کلیہ کو معلوم کر لینے

کا نتیجہ تھا کہ سائنس کا کارواں مسلمان حکماء کی قیادت میں رواں دواں ہوا۔ ظاہر ہے کہ جب تک یہ اطمینان حاصل نہ ہو کہ یہ دنیا ایک ہی یکساں اور غیر متبدل قانون کے ماتحت کام کر رہی ہے اور یہ کہ ایک مرتبہ اگر کسی قانون کو مشاہدہ اور تجربہ کی کسوٹی پر پرکھ کر معلوم کر لیا جائے تو پھر یہ قانون کائنات کے تمام حصوں میں کسی تناقض یا انحراف کے بغیر کارفرما نظر آئے گا تاآنکہ اس سے مختلف یا متعارض کوئی اور قانون دریافت نہ کر لیا جائے یا کسی اور حیثیت سے اس قانون فطرت کا علم آگے نہ بڑھ جائے۔ چنانچہ اگر ایشیا کے علاقہ میں درجہ صفر پر انجماد واقع ہوگا تو اوشیانیا کے خطہ میں بھی ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ جب تک یہ یقین حاصل نہ ہو اس وقت تک سائنس ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں قرون اولیٰ میں جس استقرائی منہاج کو فروغ حاصل ہوا وہ ان کے پیغمبر رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ توحید پرستانہ نظریہ کائنات کا فیض تھا۔ ہمیں یہ بات ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں بھولنی چاہئے کہ یہ محض اتفاقیہ طور پر نہیں ہوا کہ انسانوں کے مابین صدیوں سے کائنات کے بارے میں تو ہم پرستانہ تصورات اور مشرکانہ عقائد رائج رہے ہوں اور پھر یکایک کسی خاص معاشرہ اور تہذیب سے اٹھنے والے کچھ لوگ اس غیر علمی رویہ کو یکسر مسترد کر کے پوری یکسوئی اور جمعیت خاطر کے ساتھ کائنات کے مشاہدہ اور مطالعہ میں لگ گئے ہوں۔ ظاہر اور بدیہی بات ہے کہ تاریخ ایسے اتفاقات کا نام نہیں ہے۔

علاوہ ازیں وہ تمام علوم و معارف جن کو وسعت و ترقی مسلمانوں کے طفیل نصیب ہوئی ان کو علماء اسلام نے ایک کل کے طور پر سمجھا اور اس طرح ان سے حاصل شدہ معلومات کو ایک مکمل دائرہ کے اندر اس نہج پر مرتب کیا کہ جملہ فروع علم کو ایک ہی اصل کے ساتھ مربوط کر کے دیکھا پھر مجموعی طور پر تمام علوم و فنون کو ایک موحدانہ نظریہ کائنات سے مربوط کر دیا۔ اس طرح انسان کے خزینہ معلومات کے تمام اجزاء ہم آہنگ ہو کر باہم دگر مربوط اور متجانس ہوتے چلے گئے۔ علم کی اس وحدت اور یکجہتی کے دیگر ثمرات کے علاوہ ایک ثمرہ یہ بھی نکلا کہ زندگی میں یک رخی آگئی اور انسان کی شخصیت تقسیم ہونے سے محفوظ رہی۔

جب مغرب کے غیر مسلم طالبان علم نے مسلمانوں کے علمی مراکز سے رجوع کیا تو انہوں نے مسلمانوں کی عطا کردہ میراث سے محض جزوی استفادہ کرنے پر قناعت کی اور استقرائی علوم ہی

کے ہو کر رہ گئے۔ شاید اس لئے کہ یورپ کی مادہ پرستانہ طبیعت کو انہی علوم میں اپنے جذبہ مادیت کی تسکین کا سامان نظر آیا۔ ہوا یوں کہ جب استقرائی منہاج اختیار کرنے کی وجہ سے اہل مغرب کو سائنس کے میدان میں کامیابیاں حاصل ہوئیں اور دوسری طرف کلیسا کو بھی امور زندگی سے رفتہ رفتہ بے دخل کر دیا گیا' تو ایک ایک کرکے اہل مغرب اپنے مذہبی تصورات سے کنارہ کشی اختیار کرتے گئے۔ اس کے نتیجہ میں جو فکری خلا پیدا ہوا اس کو پر کرنے کے لئے انہوں نے پہلے تو خالص عقلیت کا سہارا لینے کی کوشش کی' پھر بالاخر انہوں نے یہ مناسب جانا کہ استقرائی منہاج کو دیگر علوم میں بھی معیار تحقیق مان لیا جائے۔ اس طرح انسانی رویوں کے مطالعہ پر مبنی علوم اجتماعیہ کو خالص مشاہدہ اور تجربہ کی بنیاد پر مدون کرنے کی بناء ڈالی گئی۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مسلمانوں نے جب استقرائی منہاج کو فروغ دیا تو ایک جامع اور ہمہ گیر نظریہ علم کے محض ایک جزء کے طور پر انہوں نے اس منہاج کو ترقی دی۔ اس کے برعکس اہل مغرب نے استقراء کو آخری اور واحد مأخذ علم قرار دے دیا۔ اس طرح مغرب ایک بار پھر اس غلطی کا مرتکب ہوا جو رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے اہل یونان نے استخراجی منطق پر کلی انحصار کر کے کی تھی۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ اہل یونان کو استخراجیت پر انحصار کرنے کی وجہ سے جن نتائج کا سامنا کرنا پڑا تھا انسانیت کے لئے ان سے کہیں زیادہ تباہ کن نتائج آج کے اہل مغرب نے استقرائیت پر انحصار کرکے پیدا کر دیئے ہیں۔ متوازن جامع اور موحدانہ نظریہ علم نہ اہل یونان نے اپنایا نہ آج کے اہل مغرب اس تک رسائی حاصل کر سکے۔

ایک جامع تصورتوحید کی واضح تعلیم کے ساتھ ساتھ آپؐ نے انبیاء و رسل کی تعلیمات سے انحراف کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اس افراط و تفریط کا بھی سدباب کیا جس کی وجہ سے انسانوں کے مذہبی رویہ میں دو قسم کی انتہاپسندی رائج ہو چلی تھی۔ ایک انتہاپسندی تو وہ تھی جس کا نقطہ کمال ہمیں مہاتمابدھ کی زندگی میں ملتا ہے اور بڑی حد تک اس کے اثرات عیسائی دنیا اور اس کے باہر دیگر ملتوں پر بھی نظر آتے ہیں۔ یہ رویہ اس تصور پر مبنی تھا کہ روحانی ترقی کے لئے مادی دنیا سے قطع تعلق لازمی ہے۔ جتنا کوئی شخص روحانی عروج کا طالب ہو اس کو اسی قدر علائق دنیوی سے کنارہ کش ہو جانا چاہئے۔ مہاتمابدھ نے روحانی عرفان و عروج کے لئے یہ ضروری

گردانا کہ وہ اپنے بیوی بچوں سمیت تمام قرابتوں اور تعلقات کو یکسر منقطع کر ڈالیں' وہ ایک رات اچانک جنگلوں میں اس طرح غائب ہوئے کہ پھر دوبارہ اپنے خاندان سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ اسی انتہا پسندانہ اور یک رخی روحانیت کے اثرات عیسائی رہبانیت کے علاوہ دیگر ایسے تمام فرقوں میں ملتے ہیں جنھوں نے زندگی سے فرار حاصل کرنے والی تاریک و تنگ نظر خانقاہیت کو فروغ دیا اور اس طرح انبیاء و رسل کی تعلیم کے اصل جوہر' "دین کی ماتحتی میں دنیا کی فلاح" کو فنا کر کے رکھ دیا۔

مذہبی رویہ کی دوسری انتہا پسندی وہ تھی جس میں انسان نے اس مادی دنیا اور محسوس و مرئی عالم فطرت کے مظاہر کی اس قدر تعظیم و تقدیس کی کہ ان کو الوہیت کے درجہ تک پہونچا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان ' جس کو دراصل خلافت کے مقام پر فائز کیا گیا تھا اور جس کے لئے یہ عالم رنگ و بو بسایا گیا تھا تاکہ وہ اپنی گوناگوں صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اس کے بوقلموں وسائل کو دریافت کر کے اپنے مقاصد کی تکمیل میں استعمال کرے' وہ انسان الٹا اس عالم طبیعت کا بندہ بن گیا اور ہر اس مظہر کی پوجا اور پرستش پر آمادہ ہو گیا جس میں اسے نفع یا ضرر کا کوئی پہلو نظر آیا۔ اس طرح اس نے اپنے آپ ؐ کو رفتہ رفتہ پہاڑوں' دریاؤں' سمندروں' آسمان و زمین' شمس و قمر' نجوم و کواکب' اور شجر و حجر کا عبادت گزار بنا ڈالا۔ اسلام نے ایسے تمام انتہا پسندانہ رویوں کو یکسر باطل قرار دیتے ہوئے واشگاف الفاظ میں یہ بتایا کہ یہ دنیا تو تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے مگر تم آخرت کے لئے بنائے گئے ہو یعنی تم اپنے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے اس سے کہیں بلند و بالا ہو کہ اس عارضی مادی دنیا کی پیروی یا پرستش کرو۔ اس لئے کہ تم اس دنیا کے تابع نہیں بلکہ یہ دنیا تمہارے ماتحت ہے۔ جب تم یہاں نہیں ہو گے تب یہ دنیا بھی نہیں رہے گی۔ یہ ایک فانی دنیا ہے اور تم ایک جاوداں ہستی ہو اور یہ دنیا آج کل کی زبان میں محض ایک Disposable چیز ہے یہ مٹنے کے لئے محض انسان کے منظر سے ہٹنے کی منتظر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ تعلیم بھی اسلام نے دی کہ انسانیت کی تکمیل کے لئے دنیا سے منہ موڑنا ہرگز ضروری نہیں ہے۔ انسان اللہ کا بندہ ہے اور اسی کا بنایا ہوا ہے۔ لیکن وہ احسن تقویم کے سانچہ میں ڈھالا گیا اشرف المخلوقات ہے۔ وہ اتنا بے بس نہیں کہ اس دنیا کو اپنی شرائط کے تابع نہ کر سکے۔ یوں پیغمبر اسلام ؐ نے دونوں انتہا پسند رویوں کے درمیان اعتدال کی راہ دکھائی۔ انہوں

نے خلیفتہ اللہ فی الارض کو تاریخ کی مخلوق بن جانے کے بجائے تاریخ کا خالق بننے کی تلقین کی۔

یہ رحمتہ للعالمین کی اس واشگاف تعلیم کی برکت تھی کہ حق کے متلاشی انسانوں کو اس دنیا کے بارے میں صدیوں سے رائج بے بنیاد مفروضات اور باطل توہمات سے نجات ملی اور علم کائنات (سائنس) ہر قسم کے طلسماتی تصورات سے آزاد ہو کر استقرائی مشاہدہ و جستجو کی راہ پر یکسوئی کے ساتھ گامزن ہوا۔ اس توحیدی تعلیم کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ذہن میں وحدت علم کا ایک واضح نظریہ راسخ ہوا۔ انہوں نے اس اصول کی بنیاد پر علوم وفنون کی تحصیل اور تشکیل کی کہ جس اللہ نے وحی کے ذریعہ انسانوں کو احکام عطا کئے ہیں وہی ذات باری اس کائنات کی خالق و مالک ہے اور اس کائنات کے تمام مظاہر وحوادث اسی وحدہ لاشریک ہستی کے دیئے ہوئے قانون فطرت کے ماتحت اپنا اپنا کام کر رہے ہیں۔ اس قانون میں کہیں کوئی تناقض یا دو عملی نہیں۔ " ماتری فی خلق الرحمن من تفاوت " (۱۲) ۔ اور " وخلق کل شیئی فقدرہ تقدیرا " (۱۳) اور ایسی بہت سی آیات محکمات کی روشنی میں مسلمان علماء اور مفکرین نے اس کتاب فطرت کی آیات بینات کو معلوم کرنے' ان کو سمجھنے اور ان کے مابین روابط کو جاننے کا بیڑا اٹھایا۔

توحید پر مبنی اس نظریہ کی رو سے انسان کو حاصل ہونے والی معلومات اور اس کے علم وادراک میں آنے والے حقائق میں درجہ بندی اور حفظ مراتب کا تو لحاظ رکھا گیا لیکن علم کے ایک کل اور مربوط وحدت ہونے کے نظریہ پر کوئی مصالحت یا مداہنت قبول نہیں کی گئی' ایسا علم جس کے مختلف اجزاء باہم متکامل اور ہم آہنگ ہیں۔ اس لیے کہ علم کا اولین اور حقیقی مأخذ اللہ تعالی ہے جس کی ایک صفت علیم وخبیر بھی ہے۔ جس طرح اس نے وحی کے ذریعہ انسانوں تک وہ ہدایت پہنچائی ہے جو ان کی فلاح وسعادت کی ضامن ہے اسی طرح اس نے انسان کو کچھ ملکات اور صلاحیتیں بھی عطا کی ہیں جن کی مدد سے وہ بہت سی ایسی معلومات حاصل کر سکتا ہے جو اس کی روز مرہ ضروریات کی تکمیل میں مدد دے سکیں ان ہی ذرائع معلومات پر تمام انسانی تمدن کا دارومدار ہے۔ یہ ذرائع جبلت' وجدان' حواس اور عقل ہیں ان ذرائع سے حاصل شدہ معلومات انسان کے لیے نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہیں۔ البتہ ان معلومات میں ایک درجہ بندی ضرور رکھی گئی ہے۔ اس طرح ہر ادنی ذریعہ علم کی تصحیح اعلی ذریعہ علم سے ہوتی رہتی ہے۔ ورنہ انسان

بھک کر گمراہی کے اندھیرے میں بھٹک جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جبلت سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان کی ایک حد مقرر ہے۔ اس دائرہ سے بڑھ کر وجدان کا دائرہ ہے ۔ جبلت کی غلطیوں کی اصلاح وجدان سے ہو سکتی ہے' اسی طرح وجدان کی اپنی حدود ہیں۔ وجدان سے معلوم شدہ امور کی تصحیح اس کے دائرہ سے باہر حواس کے دائرہ سے ہو سکتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جو معلومات حواس سے فراہم ہوتی ہیں اور یادداشت ان کو محفوظ کرتی رہتی ہے' ان کی ترتیب واستنباط کا کام عقل انجام دیتی ہے اور عقل ہی ان کی نگرانی کا وظیفہ بھی ادا کرتی ہے اور ان کو رہنمائی فراہم کرکے تعدی اور تجاوز سے محفوظ رکھتی ہے۔ بالکل اسی طرح ان تمام ذرائع معلومات سے اعلی اور ارفع ذریعہ علم وحی ہے جس کے ذریعہ علام مطلق کی جانب سے اس کے چنے ہوئے برگزیدہ انسان (نبی اور رسول) کی معرفت انسانوں کو رشد وہدایت فراہم کی جاتی ہے۔ نبی اور رسول ان امور کے بارے میں رہنمائی کرتا ہے جو مذکورہ بالا ذرائع علم کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ وہ عالم غیب سے آمدہ اطلاعات کی بنیاد پر انسانوں کے قلوب و اذہان میں اٹھنے والے ان بنیادی سوالات کا جواب فراہم کرتا ہے جن پر انسان کی فلاح و نجات کا دارومدار ہوتا ہے۔

اس تصور علم کے مطابق وحی پر ایمان لانے اور اس کے مطالبات پر عملدرآمد سے انسانوں کو میسر دیگر ذرائع علم کی نفی نہیں ہوتی بلکہ خود وحی کے مقتضیات پر عملدرآمد کے لئے ضروری ہے کہ ان ذرائع کو پوری طرح استعمال کیا جائے اور وحی کے مقرر کردہ مقاصد و معیارات کا ان کو پابند کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت محمدی نے فاترالعقل اور فاقد الحواس اشخاص کو مکلف قرار نہیں دیا۔ صرف اس لیے کہ عقل اور حواس کی سلامتی اور ان کے مثبت عملی کردار کے بغیر پیغام وحی کی توضیح و تطبیق ممکن نہیں۔

یہ اسی ربانی تعلیم اور پیغمبرانہ تربیت کا نتیجہ تھا کہ قرون اولی کے مسلمان علماء اور حکماء نے جہاں ایک طرف علوم دین کو بے مثال ترقی دی وہاں علوم کائنات کو بے حد فروغ دیا۔ یہ رحمتہ للعالمین کی فکری رہنمائی کا ہی فیض تھا جس کے طفیل مسلمان حکماء نے میدان علم و حکمت میں اپنی شہسواری کے مظاہرے کر کے رہتی دنیا تک اپنوں سے تحسین اور غیروں سے اعتراف حاصل کیا۔ آج بھی مغرب کے وہ مورخ جن کے ذہن ابھی تعصب کی گرد سے آلودہ نہیں ہوئے حکمائے اسلام کے ان تاریخی کارناموں کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے جن کی بدولت مغرب کی دنیا

سائنس سے کماحقہ متعارف ہوئی (۱۴)۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ ملاحظہ ہو سورہ آل عمران : آیت ۱۶۴ اور سورۃ الجمعہ : آیت ۲: علاوہ ازیں یہ مضمون قرآن کریم میں جابجا اور مختلف سیاق و سباق میں بیان کیا گیا ہے اور اپنی ہدایت کی بناء پر کسی بحث کا محتاج نہیں۔

۲۔ الانبیاء : آیت : ۱۰۷: سباء: آیت ۲۸۔

۳۔ سباء : آیت ۴۶: آل عمران آیت ۱۹۱' البقرۃ : آیت ۱۶۴: الانعام : آیات ۹۵: الاعراف: آیات ۵۴ تا ۵۸ ۔ حصول علم اور استعمال و حواس کے ذریعہ تفکر و تامل بھی قرآن کریم کے بنیادی مضامین میں سے ہے اور وحی و رسالت سے حاصل شدہ ہدایات کی تائیدی شہادت کے طور پر بکثرت بیان کیا گیا ہے۔

۴۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ قرآن کریم میں عمل صالح کا تذکرہ تو علیحدہ سے کیا گیا ہے مگر جہاں بھی ایمان' علم و معرفت یا مشاہدہ کائنات کا ذکر ہے وہاں ساتھ ہی عمل کی اہمیت بھی واضح کر دی گئی ہے۔

۵۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے جب کبھی کسی شخصیت کو علمی مرجع اور فکری سند کی حیثیت دی تو اس کی روشن سیرت یا اور بے داغ کردار کو دیکھ کر ہی دی ایسا نہیں ہوا کہ کسی علمی بزرجمہر یا فکری بقراط کو محض اس کی علمی شان یا عقلی حیثیت ہی کی بناء پر رجعیت حاصل ہو گئی ہو ۔ خصوصاً علماء حدیث نے قبول روایت میں جس کڑے اخلاقی پیمانہ سے افراد کو پرکھا ہے اس کی مثال انسانی تاریخ میں ملنی شکل ہے۔ اسی طرح جن فقہاء مجتہدین کی تقلید کی گئی اور آج تک عالم اسلام کے طول و عرض میں کی جا رہی ہے ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے زمانہ میں اور شاہد بعد میں بھی تقویٰ اور تدین کے ایسے مقام پر فائز تھا جس کی نظیر معدوم نہیں تو نادر ضرور ہے۔ اموی اور عباسی عہد کے خلفاء میں بعض حضرات علوم دین میں انتہائی بلند حیثیت کے حامل تھے مثال کے طور پر عبدالملک بن مروان یا ہاں‌ون اور ماموں' لیکن مسلمانوں نے ان کو قابل تقلید نہیں سمجھا اور اتباع دین میں اگر پیروی کی تو امام مالکؒ ' امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ جیسی ہستیوں کی جن کے پاس نہ صرف یہ کہ کوئی دنیاوی اقتدار نہ تھا بلکہ ان سب حضرات کے تعلقات حکام وقت سے عموماً کشیدہ ہی رہے اور انہوں نے مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا فریضہ ہر قسم کی ترغیب و ترہیب سے بالاتر ہو کر کیا۔ چنانچہ بے مثال سیرت و کردار اور امت مسلمہ کے درمیان مقبول و معتمد ہونے کی وجہ سے خود خلفاء ان بزرگان دین کی خوشنودی کے طلب گار ہوتے اور اللہ کے یہ ولی غنی رہتے۔

۶۔ النور: آیت ا' اس کے علاوہ بہت ہی آیات میں یہ بات کہی گئی ہے۔

۷۔ البقرۃ : آیت ۲۔

۸۔ حم السجدۃ : آیت ۳، سورۃ القمر: آیات ۱۵، ۱۷، ۲۲، ۳۱، ۴۰

۹۔ ابراہیم : آیت ۵۲۔

۱۰۔ البقرۃ : آیت ۲۵۶۔

۱۱۔ الحجرات : آیت ۱۳۔

۱۲۔ الملک : آیت ۳۔

۱۳۔ الفرقان : آیت ۲۔

۱۴۔ دور حاضر کے متعدد مغربی مورخین نے اس حقیقت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:

Robert Briffault , The Making of Humanity, Lahore 1980:

باب پنجم بعنوان "دارالحکمت"، صفحات ۱۸۴ تا ۲۰۲۔